غزل

روشنی بجھ گئی تہذیب کے میناروں میں
آدمی پھر نہ چلا جائے کہیں غاروں میں
آج بھی وجہ ہلاکت ہے تصرف کی ہوس
وہی قصہ ہے مگر فرق ہے کرداروں میں
اب ہیں ایوان و محلات پہ نظریں ان کی
بکنے والے نظر آئے نہیں بازاروں میں
سر نہ بچ پائے کبھی، ان کا مقدر تھا یہی
کھنچ گئے دار پہ یا بندھ گئے دستاروں میں
کم نظر ہونے کی پاتے ہیں سزا قدرت سے
مبتلائے غم شہرت ہیں جو فنکاروں میں
جو اڑی پھرتی ہے صحرا میں بگولوں کی طرح
بیٹھ جاتی ہے وہی خاک چمن زاروں میں
ہائے کیا لوگ تھے، ترسے ہوئے پھولوں کیلئے
خوشبوئیں ڈھونڈھتے پھرتے رہے انگاروں میں
سرحدیں بانٹ نہیں سکتیں دلوں کو عابد
لوگ دروازے بنا لیتے ہیں دیواروں میں

پروفیسر عابد صدیق
بہاولپور

یہاں خوفِ خُدا کوئی نہیں ہے

وفاؤں کا صلہ کوئی نہیں ہے
ہمیں تم سے گلہ کوئی نہیں ہے
لیا تھا قرض جن یاروں نے ہم سے
ہمیں اب تک ملا کوئی نہیں ہے
سفارش اور رشوت وہ مرض ہے
یہاں جس کی دوا کوئی نہیں ہے
گئے جب دفتروں میں تو کھلا یہ
یہاں خوف خدا کوئی نہیں ہے
سبھی کے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں
اگرچہ بولتا کوئی نہیں ہے
رکوں تو ہر طرف ڈاکو کھڑے ہیں
"چلوں تو راستہ کوئی نہیں ہے"
پتا کس سے بھلا پوچھوں تمہارا
"گلی میں جھانکتا کوئی نہیں ہے"
برا ہے کس قدر جرم غریبی !!
"مجھے پہچانتا کوئی نہیں ہے"
رواں کشتی ہے اپنی پھر بھی تائب
اگرچہ ناخدا کوئی نہیں ہے

پروفیسر محمد اکرام تائب عارف والا